Al-Azhār

Volume 8, Issue 2 (July-December, 2022)

ISSN (Print): 2519-6707

Issue: http://www.al-azhaar.org/index.php/alazhar/issue/view/19

URL: http://www.al-azhaar.org/index.php/alazhar/article/view/404

Article DOI: https://doi.org/10.46896/alazhr.v8i02.404

Title The Debate of Interfaith Relations: A Study of Contemporary Muslim Thought of the Sub-Continent

Author (s): Yasir Arafat,Zia ur Rehman ZiaLecturer , Faisalabad and Sadia Rehman

Received on: 26 January, 2022

Accepted on: 27 March, 2022

Published on: 25 December, 2022

Citation: Yasir Arafat,Zia ur Rehman ZiaLecturer , Faisalabad and Sadia Rehman”” Al-Azhār: 8 No.2 (2022): 1-21

Publisher: The University of Agriculture Peshawar

Click here for more

مذاہب کے درمیان تعلقات کی بحث: برصغیر پاک وہند کی معاصر مسلم فکر کا مطالعہ

The Debate of Interfaith Relations: A Study of Contemporary Muslim Thought of the Sub-Continent

***Yasir Arafat**
****Zia ur Rehman Zia**
*****Sadia Rehman**

Abstract:

The contemporary world has become a global village, which has minimized the distances between the states, nations and people. Interaction level among people of different communities, cultures and religions has developed rapidly in the last few years. Like other needs of the modern world, the interfaith relationship has become the need of the hour for peaceful co-existence in modern-day societies. Muslim scholarship has shown great concern about interfaith relations, the nature of these relations, and their scope in the modern world. They produced valuable literature and material in this regard. This article is a specific study of the Muslim thought of the sub-continent about interfaith relations. Three contemporary Muslim scholars and thinkers(Dr. Tahir -ul- Qadri(Pakitan), Zaki -ur- Rehman Ghazi Falahi Madani(India) and Mufti Akhtar Imam Adil Qasmi(India) and their thought about interfaith relations has been studied and discussed. These scholars are considered representatives of the traditional and modern circles of Muslim scholarship.

***Keywords**: Interfaith, Islam, Muslim Thought, Sub-Continent*

……..

* *Associate Professor, Department of Islamic Studies, Government College University Faisalabad*
** *Lecturer, Department of Islamic Studies, Government College University Faisalabad*
*** *Lecturer, Department of Islamic Studies ,Jinnah College for Women, University of Peshawar, Pakistan*

اکیسویں صدی عیسوی کے معاصر عالم میں دنیا عالمگیر گاؤں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔اس صدی کی تبدیلیوں نے جہاں دیگر سماجی میادین کو متاثر کیا ہے وہیں مذہب اور اسکے ماننے والوں کو بھی کئی زاویوں پر سوچنے اور لائحہ عمل مرتب کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تکثیری معاشروں میں فکری و تہذیبی اور مذہبی تنوع کے ہوتے ہوئے باہم امن وروادای اور ہم آہنگی کے ساتھ رہنا اور اسکی ممکنہ صورتیں، مذہبی فکر کے لیے اہم سوال بن کر سامنے آیا ہے۔ مختلف مذاہب کے علماء و مفکرین نے اپنی دینی و مذہبی اساس کو مد نظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب دینے کی مساعی کی ہے۔ عالم اسلام کے دیگر علماء وفضلاء کی طرح پاکستانی وہندوستانی علماء نے بھی اس حوالے سے فکری و عملی سطح پر خطوط متعین کرنے کی مساعی کی ہے۔ اس بارے علمی مقالات اور کتب تحریر کی گئی ہیں۔ برصغیر پاک وہند کی قدیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند انڈیا نے اسلامی رواداری کے عنوان سے مستقل جامع کتاب شائع کی۔ اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا نے متعدد مجالس بپا کیں اور مختلف مذہبی اداروں اور تنظیموں نے تکثیری سماج میں طرز فکر و عمل کے لیے راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ پاکستانی عالم پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات بارے مفصل لکھا۔ معاصر ہندستانی عالم ذکی الرحمن غازی مدنی نے نوسو کے قریب صفحات پر مشتمل جامع علمی کتاب تصنیف کی ہے کہ جس میں رہنمائی کی گئی ہے کہ ایک مسلمان کو دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ ایک سماج یا ریاست میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر کیسے رہنا ہے ۔اسی طرح ایک اور ہندستانی عالم مفتی اختر امام عادل قاسمی نے مذاہب کے درمیان مذاکرات بارے اسلام کے نقطہ نظر کی جامع نشاندہی کی ہے۔ مذکورہ تین اہل علم نے جہاں دیگر مذاہب کے ساتھ انفرادی واجتماعی سطح پر ممکنہ تعامل و تعلق بارے روایتی اسلامی نقطہ نظر کی نشاندہی کی وہیں معاصر عالم میں عصری تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بین الاقوامی اتحاد اور سماجی امن وسلامتی کے لیے مساعی کی ضرورت واہمیت کو براہین ودلائل سے مزین کر کے پیش کیا۔ مقالہ ہذا میں ان علماء کی فکر کا مطالعہ وجائزہ پیش کیا جائے گا۔

علمی وفکری حلقوں کی مباحث میں ایک اہم بحث اس امر پر بھی ہے کہ اکیسویں صدی عیسوی میں مذہب کی ضرورت اور کردار کتنا اہم ہے اور آنے والے دنوں میں یہ کتنا ضروری اور اہم ہو گا۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے میادین میں غیر معمولی ارتقاء اور مادی ترقی نے انسانیت کو انفرادی واجتماعی سطح پر بہت متاثر کیا ہے۔ اور یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ معاشی ترقی اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی مذہب بیزاری کے رجحان کو فروغ دیتی ہے اور سیکولر

فکر غلبہ پاتی ہے۔ اس حوالے سے عام طور پر یورپی ممالک کی مثال دی جاتی ہے۔ کہ جہاں سیکولرائزیشن کا غلبہ بڑھتا جارہا ہے۔ لیکن امریکی میگزین دی ویک(The Week) کا فرانسیسی نژاد لکھاری پاسکل ایمانویل (Pascal-Emmanuel) اس نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ مجموعی طور پر یہ رائے قائم کرنا درست نہیں ہو گا۔ وہ لکھتا ہے:

First, let's dispense with the notion that there is some necessary causal link between economic and technological advancement and secularization. One need only look at South Korea, which was one of the poorest countries on the planet at the end of World War II, and is now one of the richest and most technologically advanced — indeed, on some metrics, more advanced than Western Europe or the U.S.At the same time that South Korea experienced this astonishing growth, Christianity in the country grew from less than 1 percent of the population to about 30 percent today.[1]

پاسکل اس تصور کو درست نہیں قرار دیتا کہ معاشی اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور سیکولرائزیشن میں باہم ربط و تعلق ہے۔ وہ اس حوالے سے جنوبی کوریا کی مثال دیتا ہے کہ جو دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر اس کرہ ارض پر دنیا کے غریب ترین ممالک میں سے ایک تھا۔ اور اب ایک امیر ترین ملک اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی یافتہ ملک گردانا جاتا ہے۔ اور بعض پہلوؤں سے یورپی ممالک یا ریاست ہائے امریکہ سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اسی دورانیہ میں جنوبی کوریا میں مسیحیت جو ایک فیصد سے بھی کم پائی جاتی تھی وہ تیس فیصد کے قریب جا پہنچی۔

پاسکل اپنے مضمون میں مدلل بحث کرتا ہے کہ سیکولرائزیشن کے مقابلے میں مذہب ایک اہم قوت کے طور پر سامنے آرہا ہے۔ اپنے مضمون کے اختتامی حصہ میں وہ لکھتا ہے:

Religion has been the most intense worldview-shaping phenomenon in history, and it will continue to be the most important worldview-shaping phenomenon of the 21st century.2

پاسکل کے بقول جس طرح مذہب تاریخ میں ورلڈ ویو کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی ورلڈ ویو کی تشکیل میں مذہب اپنا کردار ادا کرے گا۔

عالمگیریت اور مذہب: جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ معاصر عالم میں سائنس اور دیگر علوم وفنون میں برق رفتار ترقی بڑے پیمانے پر تغییر و تبدل کا باعث بنی ہے۔ سیاست، معیشت، سماج، افکار و نظریات غرض شاید ہی کوئی میدان ہو جو تبدیلی کے اثرات کا شکار نہ ہوا ہو۔ دنیا سکڑ کر ایک عالمی گاؤں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ کہ

جس کی بناء پر مختلف امور میں ایک دوسرے سے متاثر ہونے سے بچاؤ ممکن نہیں رہا۔ عالمگیریت نے متعدد تحدیات کو جنم دیا ہے۔ گو کہ بنیادی طور پر اسے معیشت سے جڑے امر اور تصور کے طور پر جانا جاتا ہے۔ لیکن اس نے انفرادی واجتماعی سطح پر تمام میادین حیات کو متاثر کیا ہے۔ اہل علم عالمگیریت کے فوائد و ثمرات بھی بیان کرتے ہیں اور اسی طرح اس کے منفی اثرات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ عالمگیریت اور مذہب کے موضوع پر بھی بہت لکھا جارہا ہے۔ اور اس حوالے سے بھی مثبت اور منفی اثرات کی نشاندہی کی جارہی ہے۔ مثبت اثرات میں یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ عالمگیریت نے مختلف مذاہب کو باہم ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔[3] اور اس طرح وہ باہمی احترام اور رواداری کے ساتھ مل جل کر سماج کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ عالمگیریت کا مرکزی میدان معیشت ومادیت ہے اور وہ اسی کے فروغ اور بڑھوتری کو اپنی مساعی کا مرکز ومحور قرار دیتی ہے۔ جبکہ مذہب روحانیت کو اپنا مرکز ومحور قرار دیتا ہے۔ عالمگیریت جہاں ایک طرف مذہبی عقائد پر اثر انداز ہوئی ہے وہیں اس نے مذہبی اختلافات کی شدت، باہم نفرت اور مذہبی تشدد کے سرعت کے ساتھ فروغ کو بھی آسان بنادیا ہے۔ مذہب انسانی سماج کے قدیم اداروں میں سے ایک ادارہ ہے۔ اس لیے مختلف سیاسی، معاشی اور نسلی ولسانی اختلافات کو مذہبی رنگ دیکر موجودہ عالمگیر معاشرے میں فساد اور بگاڑ پیدا کرنا بہت سہل ہوگیا ہے۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ عالمگیریت نے جہاں تحدیات کو جنم دیا ہے وہیں بہت سارے مواقع بھی پیدا کردیئے ہیں۔ کہ جن سے فائدہ اٹھا کر عالمی گاؤں میں تعمیر وترقی کے سفر کو جاری رکھا جاسکتا ہے۔

دنیا کے اس عالمی گاؤں میں اقوام متحدہ نے نے اس گاؤں کی حفاظت اور ترقی کے حوالے سے پائیدار ترقی کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔ جسے 2015ء میں سامنے لایا گیا۔ اس منصوبہ کے سترہ مقاصد طے کیئے گئے ہیں۔ جن میں سے سولہواں مقصد دنیا میں امن، انصاف اور مضبوط اداروں کا قیام ہے۔[4] اب دنیا میں امن کے قیام کے حوالے سے سب سے اہم ادارہ مذہب کا ہے۔ تکثیری سماج میں مختلف مذاہب کے پیروکار رہتے ہیں۔ جو بہت سارے امور میں ملتی جلتی تعلیمات کے حامل ہونے کے باوجود اختلافی پہلو بھی رکھتے ہیں۔ فکری وتہذیبی تنوع اور مذہبی تعدد کے ہوتے ہوئے تکثیری معاشرے میں امن و امان کا قیام اور ہم آہنگی وباہمی رواداری کا فروغ ایک ضروری امر ہے۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان امن، ہم آہنگی، بقائے باہمی اور رواداری کے قیام

کے لیے ضروری ہے انکے درمیان مکالمے کو فروغ دیا جائے۔ مختلف ادیان ومذاہب کے اہل فکر ودانش اس حوالے سے مساعی کررہے ہیں کہ تکثیری سماج میں امن ،بھائی چارہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کو ممکن بنایا جاسکے۔ مذاہب کے درمیان تعلقات اور ربط وتعامل کے حوالے سے پاکستانی اور ہندوستانی علماء بھی سرگرداں ہیں۔ معاصر مسلمان علماء میں پاکستان سے ڈاکٹر محمد طاہر القادری اور ہندوستان سے ذکی الرحمن غازی مدنی اور مفتی اختر امام عادل قاسمی نمایاں ہیں۔ اس مقالہ میں ان تینوں اہل علم کی کاوشوں کا مطالعہ وجائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری:

محمد طاہر القادری پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہر جھنگ میں 1951ء میں پیدا ہوئے۔ معروف مذہبی تحریک، تحریک منہاج القرآن کے بانی ہیں۔ مختلف علوم پر انکی پانچ سو کے قریب کتب چھپ چکی ہیں۔ دنیا میں کئی ممالک میں انکی تنظیم کے حلقے موجود ہیں۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے جن میادین میں کام کیے ہیں ان میں ایک نمایاں میدان مسلمانوں کے اہل کتاب اور دیگر غیر مسلموں سے تعلقات ہیں۔ وہ مختلف مذاہب کے درمیان مکالمہ کے بھی ایک بڑے داعی شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر قادری نے 1998ء میں مسلم اور مسیحیوں کے درمیان مکالمہ کے لئے "مسلم مسیحی ڈائیلاگ فورم" قائم کیا۔ اور بعد میں مسلمانوں کے دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ تعلقات کو فروغ دینے کے لیے 2006ء میں "نظامت بین المذاہب تعلقات" کو تشکیل دیا۔[5] "اسلام میں اقلیتوں کے حقوق" کے عنوان سے ڈاکٹر طاہر القادری کی ایک کتاب ستمبر 2006ء میں مرتب کرکے شائع کی گئی۔ اس کتاب میں اسلامی یا مسلمانوں کی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں کو جو حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ وہ قدرے اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اور اس حوالے سے دور نبوی اور خلافت راشدہ کے دور سے امثلہ ذکر کی گئی ہیں۔ اسی طرح اگست 2010ء میں ڈاکٹر طاہر کی کتاب "اسلامی ریاست میں غیر مسلم کے جان ومال کا تحفظ" کے منصہ شہود پر آئی جو تین ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی باب غیر مسلموں کے قتل عام اور ایذا رسانی کی ممانعت بارے اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب دوران جنگ غیر مسلموں کے قتل عام کی ممانعت اور تیسرا باب غیر مسلموں کے جان ومال اور عبادت گاہوں کے تحفظ بارے اسلامی نقطہ نظر کی توضیحات کا حامل ہے۔ "اسلام اور اہل کتاب (تعلیمات قرآن وسنت اور تصریحات آئمہ دین)" کے عنوان سے ڈاکٹر طاہر نے

چار سو اسی صفحات پر مشتمل مبسوط کتاب لکھی۔ جو جولائی 2014ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ کہ جن میں اہل کتاب و غیر اہل کتاب کا فرق قرآن کی روشنی میں اور پھر احادیث کی روشنی میں ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح اسلام کے ہاں اہل کتاب کے دعوی توحید پر اعتبار کے حوالے سے اکابر آئمہ کی تصریحات پیش کی گئی ہیں۔ اہل ملت اور غیر اہل ملت کے احکامات میں فرق کی بابت ایک باب قائم کیا گیا ہے۔ کتاب کا ایک باب اہل کتاب کے بارے امام ابن القیم کی کتاب احکام اہل الذمۃ سے ماخوذ ہے۔ ایک باب میں غیر مسلموں کے حقوق اور انکے ساتھ تعلقات کی نوعیت پر مشتمل ہے۔ اور آخری حصہ میں اسلام میں ممالک کی تقسیم (معاہدات و مواثیق کے تناظر میں) پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد نومبر 2015ء میں ڈکٹر قادری کی دوسری کتاب "مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات" کے عنوان سے منصہ شہود پر آئی کہ جو در حقیقت ماقبل مذکور کتاب کا ہی ایک حصہ ہے جسے الگ عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف تقاریر، علمی مجالس اور تقریبات میں بین المذاہب تعلقات کے قیام اور فروغ کے حوالے سے ڈاکٹر طاہر القادری بہت سرگرم شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

اسلام اور اہل کتاب نامی تصنیف میں ڈاکٹر طاہر القادری نے یہود و نصاری کے بارے میں نصی تعلیمات اور علماء و آئمہ کی تصریحات بڑی تفصیل سے ذکر کی ہیں۔ یہود و نصاری کے بارے میں شرعی حکم ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر طاہر کہتے ہیں کہ اس حوالے سے دو قسم کے احکام تصریحا ملتے ہیں۔ ایک ان کے عدم قبول اسلام کے باعث تکفیر کا حکم اور دوسرا دیگر کفار و مشرکین سے انکی شرعی حیثیت مختلف ہونے کا حکم۔ اس دوسرے پہلو پر کتاب میں بہت زیادہ بحث کی گئی ہے۔ صاحب تصنیف کا یہ نقطہ نظر ہے کہ مذکورہ دونوں گروہوں کے اعتقادی بگاڑ اور کتابی تحریفات کے باوجود قرآن و سنت نے انکا 'اہل کتاب' ہونا برقرار رکھا۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں:

"ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہود و نصاری کو قرآن مجید میں 31 مرتبہ 'اھل الکتاب' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ جبکہ 16 مرتبہ 'الذین اوتوا الکتاب' کہہ کر اور 8 مرتبہ 'اتینا ھم الکتاب' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید نے یہود و نصاری کو انہی عقائد و اعمال کے مجموعے کے ساتھ نہ صرف 'اہل کتاب' تسلیم کیا ہے بلکہ اس عنوان کی تسلسل کے ساتھ توثیق کی ہے۔"[6]

مذکورہ رائے کے بعد صاحب تصنیف نے درجنوں صفحات پر محیط ادلہ قرآنیہ ذکر کی کی ہیں کہ جن میں اہل

کتاب کو مخاطب کرنے اور دیگر کفار و مشرکین کو خطاب کرنے کا فرق بتایا گیا ہے۔ صاحب 'اسلام اور اہل کتاب' یہ باور کروانا چاہتے ہیں کہ اہل کتاب کو دیگر کفار کی طرح نہیں گردانا چاہیئے۔ جب انکے ذبیحہ کو حلال قرار دیا گیا ہے اور کتابیہ عورت سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ تو انکے ساتھ ربط و تعلق اور مکالمہ کو فروغ دینا چاہیئے۔ کچھ ایسا ہی نقطہ نظر معاصر نوجوان عالم عمار خان ناصر کا ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے مجلہ الشریعۃ کے نومبر 2017ء کے شمارے میں شامل اپنے مضمون میں کیا۔[7] اس کے بعد ڈاکٹر طاہر القادری یہ نقطہ نظر ذکر کرتے ہیں کہ اہل کتاب کے عقیدہ توحید کے دعوی (فقط دعوی کو) کو شرعا تسلیم کیا گیا ہے۔ اور ایک اعتبار سے یہود و نصاری اہل ملت توحید میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے دیگر غیر مسلموں کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے وہ ان دو گروہوں کے ساتھ نہیں کیا جائے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ ہمارے بعض علماء حضرات اپنی تحریر و تقریر میں دیگر کفار کی بہ نسبت اہل کتاب سے نفرت و حقارت کا درس زیادہ دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ حضور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام حتی کہ جمیع آئمہ نے ان کا حکم بقیہ تمام غیر کتابی کفار و مشرکین یعنی بت پرستوں، ستارہ پرستوں یا آتش پرستوں وغیرہ سے جدا رکھا۔ اس لیے ان (اہل کتاب) کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا گیا۔ کیونکہ وہ اہل ملت تھے۔ اس کے برعکس غیر کتابی کفار و مشرکین کا نہ ذبیحہ جائز رکھا اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا گیا۔ کیونکہ وہ اہل ملت نہ تھے۔ اہل کتاب یہود و نصاری کا یہی اہل ملت ہونا انہیں غیر مسلموں میں سے believers اور غیر کتابیوں کا اہل ملت نہ ہونا انہیں non-believers بناتا ہے۔"[8]

ڈاکٹر طاہر بنیادی طور پر اہل السنۃ کے بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن بہت سارے امور میں تحریر و تقریر اور تعامل میں انہوں نے جو اقدامات کیے ان کی بناء پر انہیں اپنے مسلک میں ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلا مسیحیوں کے لیے اپنی مسجد کے دروازے کھولنا (مستقل طور پر کہ وہ جب چاہیں مسجد میں آکر اپنے مذہب کے مطابق عبادت کر سکتے ہیں) اور اپنے ادارہ میں کرسمس کی تقریب منعقد کروانا وغیرہ۔ اسی طرح انکے بارے میں یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے۔ کہ اہل کتاب کے حوالے سے انکی تصریحات بھی قدرے غلو کی حامل ہیں۔ راقم کی نظر میں معاشرے میں یہود و نصاری کے حوالے سے علماء کی تحاریر و تقاریر میں مذکورہ گروہوں سے نفرت اور دوری کا بیانیہ عام ہو چکا تھا۔ جیسا کہ منقولا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر قادری نے یہود و نصاری سے تعلقات کی بحث میں قدرے رد عمل کے طور پر ان دو گروہوں کی حیثیت اور ان سے تعلقات

استوار کرنے کے باب میں ایک درجے میں مبالغے سے کام لیا۔ جسے روایتی مذہبی حلقوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

ڈاکٹر طاہر القادری نے مذاہب کے درمیان مکالمہ ومذکرات کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ اور اس حوالے سے فکری و عملی اقدامات کیے ہیں۔ مذاہب کے درمیان مذکرات وتعلقات کے حوالے سے مذہبی طبقہ کی عدم توجہی پر ڈاکٹر قادری نالاں ہیں۔ مذہبی طبقہ پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "ہمارے کچھ علما محض اپنے اپنے مخصوص اور محدود ماحول میں بند رہتے ہیں۔ وہ دین اسلام کے اندر بین المسالک رابطہ ومکالمہ (Intra-Faith Dialogue) سے بھی کوسوں دور ہوتے ہیں، چہ جائیکہ وہ بین الاقوامی سطح پر بین المذاہب رابطہ و مکالمہ (Interfaith Dialogue) تک اپنا دامن فکر اور زاویہ نگاہ وسیع کریں"[9]

ڈاکٹر طاہر القادری کی مذکورہ کتب وتحریرات کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ وہ مذاہب کے درمیان مکالمہ اور باہم تعلقات کے قیام کے حوالے سے سرگرم ہیں۔ اور اپنی کتب میں مواد کی ترتیب اور پیشکش میں اپنے اس غالب رجحان کے ساتھ بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کو دیگر مذاہب کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹر قادری اپنی کتب میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے فقہاء یا روایتی علماء کی طرح موالات، مواسات اور مدارات کی تقسیم ذکر نہیں کرتے۔ اور نہ ہی اس حوالے سے جزوی فقہی امور کے تذکرے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ انہی امور تک خود کو محدود رکھتے ہیں کہ جن میں غیر مسلموں کے حقوق، انکے ساتھ مساوی سلوک، عدل، رواداری اور شرف وتکریم کی تعلیمات مذکور ہیں۔ راقم کے خیال میں تکثیری سماج میں امن کے ساتھ رہنے اور معاصر عالم میں مذہبی طبقے کی ذمہ داریوں کے احساس کرنے کے اعتبار سے ڈاکٹر طاہر القادری کی مساعی قابل قدر ہے۔ لیکن بعض امور جیسا کہ اپنے ادارے میں کرسمس منانے اور اسکا کیک کاٹنے کی تقریب کا اہتمام کرنا تھا اور اپنے زیر انتظام مسجد کو مسیحیوں کے لیے مستقل طور پر عبادت کے لیے کھولنے کا اعلان کرنا ایسے اقدامات تھے کہ جنہوں نے انہیں اپنے مسلک کے ساتھ ساتھ روایتی مذہبی فکر کو ڈاکٹر قادری سے بدگمان اور دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ذکی الرحمن غازی فلاحی مدنی:

ذکی الرحمن غازی فلاحی مدنی ہندوستان کے نوجوان عالم ہیں۔ کہ جو جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ انڈیا میں بطور استاد اپنی ذمہ داریاں سرانجام دے رہے ہیں۔ انکی اب تک چالیس سے زائد کتب متنوع موضوعات پر شائع ہو چکی

ہیں۔ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات سے جڑی مباحث پر انکی تین مبسوط کتب منصہ شہود پر آچکی ہیں۔ انکی ایک مبسوط کتاب "غیر مسلموں سے تعلقات کی شرعی حیثیت" (آٹھ سو بیاسی صفحات پر مشتمل) کے عنوان سے 2014ء میں انڈیا سے شائع ہوئی۔ اسی طرح دوسری تصنیف "غیر مسلموں سے متعلق شرعی احکام" ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمان اقلیتوں کے مسائل کے حوالے سے ذکی الرحمن نے "مسلم اقلیتوں کے شرعی مسائل" کے عنوان سے ایک ہزار صفحات کی حامل کتاب تحریر کی۔ جو 13 ابواب پر مشتمل ہے۔ ذکی الرحمن نے قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ فقہی ذخیرے سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح انکی کتب کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ معاصر فقہائے امت کے علمی خزائن سے بھی استفادہ کر کے جابجا انکے تذکرے کرتے ہیں۔ مولانا فلاحی مدنی معاصر تکثیری سماج اور اس میں مسلمانوں کے دیگر مذاہب اور انکے ماننے والوں سے تعلقات کی ضرورت واہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"رشتہ انسانیت ایسا رشتہ ہے جو تمام انسانوں کو رشتہ اخوت میں منسلک کر کے انہیں ایک دوسرے کے سکھ دکھ کا ساتھی ورفیق بنا دیتا ہے۔ اسلام نے انسانی تعلقات کو بہتر بنانے کی سخت تاکید کی ہے۔ اسلامی شریعت نے ایک طرف اگر مسلمانوں کے آپسی تعلقات کی اصلاح پر زور دیا ہے، تو وہیں غیر مسلم انسانی بھائیوں سے بھی خوشگوار تعلقات رکھنے کی تاکید کی ہے۔ میل جول اور تعلقات، انسانی تمدنی زندگی کا لازمی حصہ ہوتے ہیں، خواہ یہ تعلقات اپنی کمیونٹی کے لوگوں سے رکھے جائیں یا باہر کے لوگوں سے۔ اسلام ایک دین فطرت ہے جو جوگ، سنیاس اور رہبانیت کے بجائے اجتماعی وتمدنی زندگی پر معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے۔ اور اسے پروان چڑھانے اور مستحکم کرنے کی ممکنہ حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس کے ماننے والے خواہ خالص مسلم معاشرے میں رہتے ہوں یا مخلوط معاشروں میں، ہر دو صورت میں غیر مسلموں سے تعلق کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دین نے ان کے ذمے غیر مسلموں کو بندگی رب کی دعوت دینے کی ہدایت ہی نہیں دی، بلکہ اسے شرعی ودینی فریضہ قرار دیا ہے۔ لہذا غیر مسلموں سے ربط وتعلق اور میل جیل رکھنا سماجی ضرورت پر مستزاد ایک دینی تقاضا وفریضہ بھی ہے"[10]

مولانا ذکی کے منقولا اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ غیر مسلموں سے تعلقات کو مسلمانوں کے لیے دینی ومذہبی فریضہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اپنی کتاب غیر مسلموں سے تعلقات کی شرعی حیثیت کو مولانا ذکی فلاحی نے بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں غیر مسلم انسانی بھائیوں کے ساتھ

کسی مسلمان کے تعامل کی تحدید و تعیین کی گئی ہے، جبکہ دوسرے حصہ میں قرآن و سنت اور امت مسلمہ کے علمی شرعی سرمائے سے ان قواعد وضوابط اور اصولی بنیادوں کے استخراج واستنباط کی مساعی کی گئی ہے جنہیں غیر مسلموں سے تعامل برتنے میں رہنما خطوط کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ مذکورہ دو حصوں کو نے مندرجہ ذیل سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

- غیر مسلموں کے ساتھ انسانی تعلقات
- غیر مسلموں کو حاصل دینی مراعات
- غیر مسلموں سے ریاستی تعلقات
- غیر مسلموں سے تعلقات کے فقہی قاعدے
- غیر مسلموں سے تعلقات کے فقہی ضابطے
- غیر مسلموں سے معاملہ کرنے کے عملی آداب
- غیر مسلموں سے تعلقات کی عمومی بنیادیں

غیر مسلموں سے تعلقات کی مختلف صورتوں اور نوعیتوں کی تفصیلات کے اعتبار سے ذکی الرحمن کا کام علمائے برصغیر کی اس میدان میں کی گئی کاوشوں میں ایک منفرد کام ہے۔ سب مباحث میں قرآن و سنت سے استدلال کے ساتھ ساتھ مستفاد شرعی احکام کی شہ سرخی کے تحت فقہی و شرعی احکامات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ لیکن اس حوالے سے اہم کاوش یہ کی گئی ہے کہ کسی ایک مسلک فقہ کا التزام نہیں کیا گیا ہے بلکہ فقہ مقارن یعنی تقابلی مطالعہ فقہ کو ترجیح دی گئی ہے۔ تکثیری سماج میں معاملات کے حل اور آگے بڑھنے کے لیے معاصر علماء کے ایک طبقے کی رائے ہے کہ اسی تقابلی مطالعہ فقہ کو سامنے رکھ کر مسائل حل کرنے کی مساعی کی جائے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کے مکمل علمی سرمائے سے استفادہ کی راہیں کھلتی ہیں۔ اور حالات وزمانہ کی رعایت کرتے ہوئے مناسب ممکنہ رائے کو ترجیح دے کر مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح مولانا ذکی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ معاصر مسلمان علماء کی علمی کاوشوں کو مد نظر رکھتے ہیں اور جابجا انکی آراء کو نقل بھی کرتے ہیں۔

مولانا ذکی فلاحی کو غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے معاشرے میں آڑے آنے والے امور کا بھی گہرا ادراک ہے۔ ضعیف اور موضوع روایات کے فروغ کے ذریعے بہت ساری باتیں عوام میں رواج پا چکی ہیں

کہ جو مذاہب کے درمیان ربط و میل یا قیام تعلقات میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

مولانا ذکی لکھتے ہیں: ۔۔۔۔ضعیف احادیث وروایات میں غیر مسلم انسانی برادران کے ساتھ معاملہ کرنے کے بارے میں جو عملی و نظریاتی ہدایات ملتی ہیں وہ اس درجہ گھٹیا ور باعث عار ہیں کہ اسلامی دعوتی ذہن تو کجا، عام انسانی ذہن بھی بآسانی ہضم نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر کسی غیر مسلم کے ساتھ مصافحہ کے بارے میں کمزور یا موضوع حدیثوں کو دیکھئے: حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے اگر کوئی کسی یہودی یا نصرانی سے مصافحہ کرلے، تو اسے چاہیئے کہ وضو کرے اور اپنا ہاتھ دھوئے۔ (من صافح یھودیا او نصرانیا فلتوضا ولیغسل یدہ)[11]

مذکورہ روایت جیسے امور کی نشاندہی کے ساتھ مولانا ذکی نے اپنی تصنیف میں صرف انہی احادیث وآثار سے استدلال کیا ہے جو محدثین کے ہاں یا انکے مطابق صحیح وثابت قرار پائے ہیں۔ مولانا ذکی مختلف امور کی بحث میں علماء وفقہائے امت کی آراء ونقطہ ہائے نظر انکے دلائل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور پھر اکثر مقامات پر کسی رائے کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔ انکی "ترجیحات" میں معاصر صورتحال میں ممکنہ حل کی معتدل ومناسب آراء کا غالب رجحان پایا جاتا ہے۔ مثلاً غیر مسلموں کو سلام کرنے کی مبحث میں آخر پر لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔غیر مسلموں کو سلام نہ کرنے کے وجوب پر ہی علمائے سلف وخلف کی بڑی تعداد کا عمل رہا ہے، لیکن صحابہ کرام اور بعد کے ائمہ عظام کی قابل قدر تعداد کے نزدیک مطلق جواز بھی ثابت ہے بعض اہل علم کا موقف قدرے تردد وتذبذب کا شکار نظر آتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ کسی ضرورت کی بناء پر غیر مسلموں کو سلام کرنا جائز ہوتا ہے، حالانکہ ان میں سے کسی کی جانب سے ایسی ضروریات کے حدود اربعہ کی تحدید و تعیین نہیں کی گئی۔ ہمارے نزدیک بہ ظاہر دل کو لگتی بات یہی ہے کہ مطلق جواز کا قول زیادہ معتبر ومستند دلائل رکھتا ہے، اسی لیے وہی ترجیح کے لائق ہے۔"[12]

کچھ عرصہ قبل سوشل میڈیا پر ایک امریکی عیسائی عالم کا ویڈیو کلپ دیکھا گیا کہ جس میں وہ اپنے دورہ مصر کا ذکر کرتے ہیں۔ اور بازار میں موجود ایک چھوٹے بچے کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ میں چند دن بازار جاتا رہا اور وہاں اس بچے سے سامنا ہوتا رہا ہر بار وہ مجھے دیکھ کر اپنے خوبصورت انداز میں السلام علیکم کہتا، وہ کہتے ہیں اس کے سلام نے مجھے اسلام کے قریب کر دیا اور میں اسلام لے آیا۔ تو موجودہ دور میں غیر مسلم کو سلام یعنی سلامتی کے

اس پیغام کے ذریعے مخاطب کیا جائے اور وہ اس پیغام کی اہمیت کو سمجھے تو ممکن ہے کہ وہ اسلام کے قریب ہو۔ بایں صورت مولانا ذکی کا "ترجیحی" قول موجودہ حالات میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح مسجد میں غیر مسلموں کے داخلے کی بحث میں دلائل اور آراء نقل کرنے بعد وہ کہتے ہیں کہ بہت سے دلائل کتاب وسنت میں پائے جاتے ہیں کہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو (مسجد حرام کے علاوہ) کسی بھی مسجد میں داخل ہوسکتے ہیں۔ مولانا ذکی لکھتے ہیں:

"دیکھا جائے تو مساجد میں داخلہ کو ایک دعوتی واصلاحی وسیلہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ مسجدوں میں غیر مسلموں کے لیے خالص یا دینی ودعوتی اجتماعات رکھے جاسکتے ہیں، تقریبات نکاح کی سادگی سے متاثر ہونے کے کیے انہیں بلایا جاسکتا ہے۔ انہیں اسلامی مساوات اور مسجد کے پاکیزہ ماحول سے سبق لینے اور اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرانے کے لیے وضو وغیرہ کراکے باقاعدہ نمازیں پڑھوائی جاسکتی ہیں۔"[13]

مذکورہ اقتباس سے بخوبی جانا جاسکتا ہے کہ مولانا ذکی الرحمن اسلام کے دیگر مذاہب کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے سنجیدہ مساعی کو اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس حوالے سے عملی طور پر اقدامات اٹھانے کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

'غیر مسلموں سے تعلقات کی شرعی حیثیت' نامی کتاب کے آخری دو ابواب میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرنے کے عملی آداب میں مولانا ذکی نے پانچ آداب جامعیت کے ساتھ ذکر کیے ہیں۔

- پہلا ادب: نرم گفتاری برتنا اور اچھی طرح دوسروں کی بات سننا
- دوسرا ادب: دوسروں کی شخصیات اور انسانیت کا احترام کرنا، لیکن ساتھ ہی ان کے مخالف شریعت اعمال وحرکات سے براءت کا اظہار کرنا
- تیسرا ادب: غیروں کی تکلیف وایذا پر صبر وتحمل اور نرم موقف اختیار کرنا
- چوتھا ادب: دعوتی کاوشوں میں امید کا دروازہ کھلا رکھنا اور دعوتی عمل کے دوران مخاطب کو مطمئن ومامون رکھنا
- پانچواں ادب: غیر مسلموں کے ساتھ گفتگو میں احسن اسلوب اختیار کرنا اور کوشش رنا کہ کسی بات سے ناراضگی وکبیدگی نہ ہونے پائے

اس کے بعد آخری باب میں غیر مسلموں سے تعلقات کی عمومی بنیادوں میں چار بنیادیں ذکر کی ہیں۔ پہلی بنیاد

جامعیت اسلام (عدل وقسط، توازن واعتدال، عقل وحکمت سے مطابقت، فطرت انسانی سے ہم آہنگی، جامعیت وشمولیت، ابدیت ودوام)، دوسری بنیاد رواداری وسماحت، تیسری بنیاد عدل وانصاف اور چوتھی بنیاد عالمیت اسلام مذکور ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرنے کے عملی آداب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے مولانا فلاحی لکھتے ہیں:

"اس کتاب کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں عملی آداب واطوار کا برتنا ایک حکم شرعی ہے۔ نیز اسے اسلامی دعوت اور دین میں رغبت دینے کا ایک اہم ترین وسیلہ بنایا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عملی آداب کا التزام کرنے سے ممکن ہے کہ آسانی کے ساتھ بغیر کچھ کہے دین کی خوبیوں کا تعارف اور لوگوں کو اس کی طرف مائل کرنے کا کام انجام دیا جاسکے۔"[14]

مولانا ذکی الرحمن غازی فلاحی مدنی کی فکر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عالمی گاؤں اور تکثیری سماج میں اسلام کا دیگر مذاہب کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ دینی فریضہ وتقاضا ہے۔ وہ خود ایک تکثیری سماج میں رہ رہے ہیں اس ابتلاء کی بناء پر وہ مذاہب کے درمیان تعلقات کی ضرورت واہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے جن میادین میں قرآن سنت نے بڑی صراحت سے احکامات دے دیئے ہیں۔ ان سے تو سرمو انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جن امور میں فقہاء کی آراء ودلائل اختلاف وتنوع کے ساتھ موجود ہیں ان امور میں حالات وزمانہ کی رعایت کرتے ہوئے مسائل کا ممکنہ حل کرنے کے لیے کسی قول کو ترجیح دے کر رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ مولانا سماحت ورواداری کو بہت اہم عنصر گردانتے ہیں۔ وہ غیر مسلموں کے ساتھ سماحت ورواداری سے پیش آنے کو بعثت محمدی ﷺ کے مقاصد میں سے ایک مقصد قرار دیتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ برتی جانے والی تعلقات کی سبھی قسمیں اسلامی سماحت کے سہارے کھڑی ہیں۔ مولانا ذکی کی فکر بین مذہبی تعلقات کے حوالے سے توسع اور اعتدال پر مبنی ہے۔ انکی اس فکر کی آبیاری میں انکے اساتذہ اور ان درسگاہوں کا بھی کردار ہے کہ جن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے اور اسی طرح جس جامعہ سے وہ آجکل وابستہ ہیں (جامعۃ الفلاح) اس جامعہ میں فقہ مقارن یعنی تقابلی مطالعہ فقہ کا نہج متداول ہے۔ کہ جس وجہ سے انہیں مسلمان اہل علم کے وسیع علمی ذخیرہ سے استفادہ کا موقع ملتا ہے۔

مولانا ذکی الرحمن غازی فلاحی معاصر دور میں مسلمانوں کی طرف سے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے مبحث مسلمانوں کی طرف سے برتے جانے والے طرز عمل کے بارے سمجھتے ہیں کہ اس باب میں مسلمانوں کے مختلف گروہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

" ہمارے دور کا المیہ یہ بھی ہے کہ امت مسلمہ کے مختلف افراد و جماعتوں کی جانب سے غیر مسلم اقوام وافراد کے ساتھ تعامل کرنے کے سلسلے میں بڑے جداگانہ ومتباین طرز ہائے عمل کا اظہار کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ اس درجہ افراط کا شکار ہیں کہ غیر مسلموں پر بلاوجہ ظلم وزیادتی کرنے تک کو جائز قرار دیتے ہیں۔، جبکہ دوسرا طائفہ ان انتہاپسندوں کا ہے جو غیر مسلموں کی محبت وپسندیدگی میں حد اعتدال سے کوسوں نیچے گر جاتے ہیں۔ دین الٰہی یعنی کہ اسلام زندگی کے اور ابواب کی طرح اس باب میں بھی یکتا ومنفرد اور اعتدال وتوسط کا حامی وداعی ہے۔ وہ یہاں بھی غلو ومبالغہ کی دونوں انتہاؤں کے بیچ صراط مستقیم کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ جو لوگ بحث وتحقیق کا کام کر رہے ہیں، قرآن وسنت کا شرعی علم رکھتے ہیں اور اللہ انہیں توفیق دے تو ضرور بالضرور اپنی بساط بھر غیر مسلموں کے حوالے سے اسلامی توسط واعتدال کو منظر عام پر لائیں ۔ غیر مسلموں کی مختلف اصناف وطوائف کے ساتھ اور ان کی جانب سے برتے جانے والے اسلام واہل اسلام کے تئیں مختلف رویوں اور موافق ومخالف اقدامات کے تناظر میں اسلامی احکام کی وضاحت کرنا فی زمانہ بہت اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ تیسرا ایک گروہ مدعیان علم کا ایسا بھی ہے جو ویسے تو مسلمان ہونے کا دعویدار ہے لیکن دینی تعلیمات واسلامی تاریخ سے بالکل نابلد ونا آشنا ہے- یہ اپنی جہالت ونادانی کی وجہ سے غیر مسلموں کے تئیں ایسا موقف اختیار کیے ہوئے ہے جس کی وجہ سے موجودہ تاریک فضا کی تاریکی میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس گروہ کے غلط افعال ومسرفانہ حرکات کی شکل میں دشمنوں کو اپنی اسلام مخالف پروپیگنڈا مہم کے لیے اچھا خاصہ مواد بھی بہم ہو رہا ہے۔"[15]

مولانا ذکی نے درست نشاندہی کی ہے کہ غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے مسلمانوں میں مختلف طرز ہائے عمل پائے جاتے ہیں۔ عصر حاضر میں ضرورت ہے کہ مسلمان علماء شرعی نصوص اور فقہاء کے مجتہدات کے عظیم ذخیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے اور حالات وزمانہ کی رعایت کرتے ہوئے وسط واعتدال پر مبنی آراء کو ترجیح دیں یا مسائل میں استنباط واستدلال کرتے معتدل ومتوسط آراء قائم کریں۔

مفتی اختر امام عادل قاسمی:

مفتی اختر امام عادل قاسمی ہندوستان کے معاصر عالم ہیں۔ وہ جامعہ ربانی منورواشریف ضلع سمستی پور بہار کے بانی و مہتمم ہیں۔ آپ متعدد علمی وفکری موضوعات پر کتب تحریر اور مرتب کر چکے ہیں۔ مفتی صاحب کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے جدید مسائل کے حوالے سے کافی لکھا ہے اور اب بھی لکھ رہے ہیں۔ جیسا کہ ماحولیاتی آلودگی (احکام ومسائل)، غذائی مصنوعات میں حلت وحرمت کے اصول اور چند حساس مسائل، حقوق انسانی کا اسلامی منشور، قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز (دوجلدوں میں) وغیرہ، اسی طرح انہوں نے مذاہب کے درمیان تعلقات، مسلم اقلیتوں کے مسائل جیسے موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ انکی ایک تصنیف بین مذہبی مذاکرات احکام وآداب کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اسی طرح ایک تصنیف غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل کے عنوان سے منصہ شہود پر آئی۔ مفتی اختر کا تعلق اہل السنۃ کے دیوبندی مکتب فکر سے ہے۔ غیر مسلموں سے مذاکرات اور تعلقات کے مبحث میں مفتی قاسمی صاحب کی تصریحات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس باب میں روایتی فکر کی ہی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور فقہاء کی غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے کی گئی موالات، مدارات اور مواساۃ کی تقسیم کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔ مفتی اختر امام غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے عہد نبوی ﷺ کے ادوار کے تین نمونے ذکر کرتے ہیں۔(1) مکی دور(2)حبشہ میں مسلمانوں کے قیام کا دور(3)مدنی دور

مکی دور مسلمانوں کی مغلوبی حالت کی علامت ہے۔ یعنی مسلمان ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں کہ جہاں غیر مسلموں کے مقابلے میں انکی سیاسی پوزیشن کمزور ہے۔ اور وہ غیر مسلموں کی مضبوط اکثریت کے مقابلے میں کمزور اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ مذہبی آزادی سے بھی محروم ہیں۔ حبشہ کا دور مسلمانوں کی حالت آزادی کی علامت ہے۔ یعنی ایسا معاشرہ کہ جہاں مسلمان سیاسی اور قومی طور پر تو اقلیت میں ہیں، لیکن مذہبی طور پر وہ آزادی کے حامل ہیں۔ اور ایک غیر مسلم اکثریت کے درمیان ایک باعزت اقلیت طور پر رہ رہے ہیں۔ مدنی دور مسلمانوں کے حالت غلبہ کی علامت ہے۔ لیکن یہ دور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے کہ جو مسلمانوں کے ابتدائی دور کا ہے جب سیاسی قوت کی تشکیل و تعمیر ہو رہی ہے۔ اور مسلمان غالب اکثریت کے باوجود ایک غیر مسلم اقلیت (یہود) کے ساتھ سیاسی معاہدہ کرتے ہیں۔ مدنی دور کا دوسرا حصہ وہ

دور ہے جب مسلمان خالص غلبہ کے حامل ہیں۔ عہد نبوی کے بعد خلافت راشدہ کا دور ہے اور بعد میں مسلمان ایک غالب قوت کے طور پر طویل عرصہ مقتدر قوت رہے۔ مفتی صاحب کے بقول مسلمانوں کے فقہی ذخیرے کا بڑا حصہ اسی عہد غلبہ کی یادگار ہے۔ علماء وفقہاء نے مسلمانوں کو ایک غالب قوت تسلیم کرتے ہوئے غیر مسلموں کے مسائل و معاملات پر گفتگو کی۔ اس حصہ میں جس طرح کی صورتحال کا سامنا تھا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی جو نوعیت ممکن کی تھی فقہاء نے اسی کے مطابق احکامات کا استخراج کیا۔ اسی لیے ہمارے فقہی ذخیرے (کتاب السیر، کتاب الجھاد، کتاب البیوع، المدونۃ، کتاب الخراج، ظاہر الروایۃ، کتاب الام، فتاوی عالمگیری، مجلۃ الاحکام العدلیۃ) میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت پر بالعموم ایک ہی انداز کی بحثیں ملتی ہیں۔ مفتی اختر لکھتے ہیں کہ اکثر فقہاء اپنے دور کے حالات و مسائل پر اپنی اجتہادی قوت صرف کرتے رہے، جس کی ضرورت تھی اور جس کے وہ پابند تھے۔ لیکن اس وقت جس صورتحال کا مسلمانوں کو سامنا ہے اس حوالے سے زیادہ رہنمائی عہد نبوی کے مذکورہ تین ادوار (مکی، حبشہ، مدنی) سے مل سکتی ہے۔ جبکہ فقہی اثاثہ اس سلسلے میں بڑی حد تک خاموش ہے۔ بعض اشارات موجود ہیں۔[16]

مفتی اختر امام عادل قاسمی نے مذکورہ پہلو سے عمدہ بحث کی ہے۔ اور انکی رائے اصابت کی حامل ہے۔ اسی طرح یہود و نصاری وغیرہ سے دوستی و تعلق نہ رکھنے سے متعلقہ نصوص کی حدوود قیود اور اطلاق وانطباق بارے مفتی صاحب نے عمدہ صراحت کی ہے۔ لیکن معاصر عالم میں غیر مسلموں سے تعلقات اور ربط و میل جول کی تصریحات میں وہ قدرے روایتی فقہی دوائر میں ہی محصور معلوم ہوتے ہیں۔ مثلا معاصر دور میں دوسرے مذاہب کے ساتھ مذاکرات کی بحث میں ان کی رائے یہ ہے کہ اگر ایسے مذاکرات کے وقت دوسرے اہل مذاہب کی طرف سے خواتین شریک ہوں یا سٹیج پر بحیثیت مقرر موجود ہوں تو مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کو ہرگز شرکت نہیں کرنی چاہیئے (بے پردگی کی وجہ سے)۔ اس لیے کہ یہ معصیت کے ساتھ اشتراک ہوگا۔[17] راقم کا خیال ہے کہ بایں صورت تو مختلف امور میں آگے بڑھنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ معاصر دور میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی خواتین اپنے مذہب کی عالمہ ہونے کی بناء پر مذاکرات کا حصہ ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح موجودہ دور میں مختلف ممالک کے اعلی ذمہ دار عہدوں پر خواتین فائز ہوتی ہیں۔ اور اپنے ملک یا ادارے کے نمائندہ کے طور پر مختلف امور کی مجالس میں شریک ہوتی ہیں۔

مفتی صاحب کی حساسیت بجا ہے لیکن بعض امور میں بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

غیر مسلموں سے سماجی تعلقات کے حوالے سے مفتی صاحب لکھتے ہیں:

"جہاں تک غیر مسلموں سے سماجی تعلقات، ایک دوسرے کی خوشی و غم میں شرکت اور مالی لین دین کے مسائل کا تعلق ہے، تو اسلام اس سے منع نہیں کرتا، اسلام ایک انسانیت دوست، انسانیت نواز اور امن پرست مذہب ہے، وہ مذہبی مسائل میں جبر کا قائل نہیں ہے، اور اسی لیے جو لوگ اسلام قبول نہیں کرتے نہ ان کا سماجی بائیکاٹ کرتا ہے نہ لوگوں کو ان سے عداوت و دشمنی پر بھڑکاتا ہے۔ نہ ان کی حق تلفی کی اجازت دیتا ہے، بلکہ وہ تمام انسانی و شہری حقوق جو کسی انسان کو مل سکتے ہیں ان کو عطا کرتا ہے۔"[18]

مفتی قاسمی صاحب غیر مسلموں سے مذاکرات و تعلقات کو سیاسی اور سماجی بنیادوں پر ممکن گردانتے ہیں۔ لیکن انکی رائے ہے کہ ان مذاکرات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی باہمی قربت ممنوعہ موالات میں داخل نہ ہو۔ اور نہ تہذیبی اختلاط کا اندیشہ ہو۔ مسلمانوں کی الگ ثقافتی اور تہذیبی شناخت کے بارے میں مفتی اختر کی فکر میں حساسیت غالب ہے۔ غیر مسلموں سے متعلقہ عمومی امور میں مفتی صاحب غالب دور کے مرتب کردہ فقہی سرمائے ہی سے مسائل کا حل کشید کرتے ہیں۔ مثلاً غیر مسلم کو سلام کرنے کے متعلق لکھتے ہیں:

"۔۔۔ غیر مسلم کو اس کی عزت افزائی کے لیے سلام کرنا جائز نہیں، بعض فقہاء نے اسے کفر تک کہا ہے البتہ کسی ضرورت کے ساتھ اس کو سلام کیا جاسکتا ہے، اس میں بھی سلام کے ایسے الفاظ استعمال کرے جس سے براہ راست اس کی تعظیم نہ ہو"[19]

غیر مسلم کو سلام کرنے کے حوالے سے جیسا ماقبل ذکی الرحمن غازی فلاحی مدنی نے دو مکاتب فکر کا ذکر کیا ہے کہ جن میں سے ایک جواز کا قائل نہیں ہے جبکہ دوسرا مطلق جواز کا قائل ہے۔ اور مولانا ذکی الرحمن نے دوسرے مکتب کی رائے کو ترجیح دی۔ آج کے دور میں جب اسلام پر کئی طرح کے اعتراضات وارد کیے جارہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے ماننے والے غیر مسلموں کو اپنے سے کمتر اور گھٹیا سمجھتے ہیں اور انکا دین انہیں غیر مسلموں کو سلام نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ بایں صورت راقم کی رائے میں مولانا ذکی الرحمن نے جس نقطہ نظر کو ترجیح دی ہے اسے قبول کرکے نہ صرف اسلام کے سلامتی کے پیغام کو عام کیا جاسکتا ہے بلکہ غیر مسلموں کی طرف سے اٹھائے گئے مذکورہ سوالات کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے۔

حاصل بحث: مقالہ ہذا میں مذاہب کے درمیان تعلقات کے حوالے سے برصغیر کی مسلم فکر کے مطالعہ وجائزہ کی مساعی کی گئی ہے۔اور اس حوالے سے تحدید و تخصیص کرتے ہوئے تین معاصر مسلمان علماء کی فکر تک بحث کو محدود رکھا گیا ہے۔ان علماء میں پاکستانی عالم پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری،ہندوستانی عالم مولانا ذکی الرحمن غازی فلاحی مدنی اور جامعہ ربانی منورواشریف سمستی بہار کے بانی مہتمم مفتی اختر امام عادل قاسمی شامل ہیں۔عالمی گاؤں اور تکثیری سماجوں میں مذاہب کے درمیان مکالمے اور تعلقات کا امر ناگزیر ہو گیا ہے۔مسلمانوں کے دینی ادب کے مطالعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکے فقہی ذخیرہ میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرنے،تعلقات قائم کرنے یا بین مذہبی مذاکرات کا حصہ بننے کے حوالے سے تعلیمات اور تصریحات موجود ہیں۔لیکن چونکہ اس ذخیرہ کا بڑا حصہ مسلمانوں کے عروج واقتدار کے عہد میں مرتب ہوا ہے۔اس لیے اس میں معاصر صورتحال اور موجودہ تکثیری سماجوں کی بابت مسلمانوں کے لیے انفرادی واجتماعی سطح پر غیر مسلموں سے تعلقات قائم کرنے کے حوالے سے میعارات وتصریحات مفقود ہیں۔گو کہ رہنمایہلو ملتے ہیں۔لیکن ان رہنما اصولوں کو مد نظر رکھ کر عصری مسائل میں تطبیقات واستنباط میں اسلام کی روح کو ملحوظ رکھا جائے کہ جو وسط واعتدال پر مبنی ہے۔معاصر عالم میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے ربط و تعلق کے کن امور واصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے،اس پہلو سے مسلمان علماء نے مفصل وجامع کام ابھی تک نہیں کیا ہے۔عرب علماء نے اس پر قدرے کچھ لکھا ہے لیکن اردو میں یا برصغیر پاک وہند کے علماء کی علمی مساعی میں اس حوالہ سے بہت کم مواد موجود ہے۔اس مقالہ میں جن علماء کا انتخاب کیا گیا ہے یہ وہ معاصر علماء ہیں کہ جنہوں نے اس میدان میں رہنمائی کی مساعی کی ہے۔ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے کام اور فکر کے مطالعہ یہ بات سامنے آتی ہے۔کہ وہ مذاہب کے درمیان تعلقات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔اور اس حوالے سے عملی اقدامات کے متمنی ہیں۔لیکن اس موضوع سے متعلقہ انکی تصانیف اور انکے تعامل سے معلوم ہوتا ہے وہ قدرے غلو کے مالک ہیں۔انہوں نے اپنی کتب میں صرف انہی نظائر اور امثلہ کو ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے کہ جن سے غیر مسلموں سے تعلقات استوار کرنے کی راہیں تو کھلتی ہیں لیکن دینی ادب میں اس حوالے سے جو حدود وقیود ذکر کی گئی ہیں انکا تذکرہ انکے ہاں مفقود ہے۔یہود ونصاری کو ملت توحید کا حصہ قرار دینے پر اصرار ،مذکورہ دونوں گروہوں کو believers کی اصطلاح کے ساتھ ذکر کرنے اور پھر عملی طور پر مسجد میں مسیحیوں کے ساتھ مل کر کر سمس

کاٹنے کی تقریب کی میزبانی نے معاصر مسلم علمی و فکری حلقوں اور خاص طور پر روایتی فکر کو ان سے بد ظن کرنے اور انکی عدم تائید کی راہ دکھائی۔ دوسرے معاصر مسلمان عالم ذکی الرحمن غازی فلاحی مدنی ہیں۔ کہ جنہوں نے مذاہب کے درمیان تعلقات کے حوالے سے اسلامی نقطہ نظر کو تفصیل سے بیان کرنے کی مساعی کی ہے۔ اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے برصغیر پاک وہند میں جتنی جامعیت سے موضوع کا احاطہ کرنے کی انہوں نے مساعی کی ہے اس میں وہ انفرادیت کے مالک ہیں۔ مولانا ذکی ہندوستان کے تکثیری سماج میں رہتے ہیں۔ اس حوالے سے بہت سارے امور کا انہیں براہ راست سامنا ہے۔ وہ جامعۃ الفلاح انڈیا میں تفسیر وادب کے استاد ہیں۔ اس جامعہ کے منہج تدریس میں فقہ مقارن یعنی تقابلی مطالعہ فقہ کا چلن ہے۔ مولانا فلاحی اپنی فکر میں بھی اسی چلن کے پیرو ہیں۔ وہ غیر مسلموں سے تعلقات، انکی نوعیتوں اور صورتوں پر بحث کرتے ہوئے پورے فقہی ذخیرہ سے استفاد کرتے ہیں اسی طرح عالم اسلام میں ان امور پر لکھنے والے جدید علماء کی تحقیقات سے بھی استفادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نصوص شرعیہ اور فقہی مجتہدات کے گہرے مطالعہ کے بعد وسط واعتدال کے ساتھ تطبیق، استنباط یا استدلال کرتے ہوئے ایک رائے قائم کرتے ہیں۔ یا مختلف فقہی آراء میں سے کسی رائے کو دلائل کی بناء پر ا(ور حالات وزمانہ کو سامنے رکھتے ہوئے) قابل عمل رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جیسے غیر مسلموں کو سلام کرنے کے باب میں مطلق جواز کے قائلین کے موقف کی تائید کرتے ہوئے اسے راجح قرار دیتے ہیں۔ غیر مسلموں سے تعلقات کے باب میں مولانا ذکی فلاحی سماحت ورواداری کو بہت اہم اصول گردانتے ہیں اور اسے بعثت محمدی کے مقاصد میں سے ایک مقصد قرار دیتے ہیں۔ راقم کی رائے میں غیر مسلموں سے ربط وتعلق کے مبحث میں مولانا ذکی الرحمن کی فکر زیادہ بہتر اور قابل عمل ہے۔ اس کا بڑا امتیاز اعتدال کا حامل ہونا ہے۔ تیسری شخصیت مفتی اختر امام عادل قاسمی کی ہے کہ جن کی فکر کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی۔ مفتی اختر صاحب روایتی مذہبی فکر کے نمائندہ ہیں۔ گو کہ وہ معاصر عالم کی صورت حال کا گہرا ادارک رکھتے ہیں۔ اور اس بات سے بخوبی واقف دکھائی دیتے ہیں۔ کہ ہمارا فقہی سرمایہ ومیراث بہت سارے جدید مسائل میں ہمیں براہ راست رہنمائی فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ اور انہی مسائل میں موجودہ دور میں غیر مسلموں سے ربط وتعلقات کا میدان ہے۔ تاہم انکی فکر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی روایتی زاویہ نگاہ سے امور کو دیکھتے ہیں۔ اور موجودہ دور میں قابل عمل حل پیش نہیں کرپاتے۔ مثلاً غیر مسلموں کو سلام کرنے کی بابت وہ اس نقطہ نظر کے

محاذین کے ساتھ ہیں کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ مذکورہ معاصر مسلم فکر کے مطالعہ وجائزہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ تاکہ واضح طور پر یہ امور طے ہو سکیں کہ انفرادی واجتماعی سطح پر مسلمانوں کو غیر مسلموں سے میل جیل اور ربط و تعلق میں کن حدود وقیود کا مد نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ تاکہ عالمی سطح پر معاصر عالم میں مذاہب کے درمیان تعلقات کے حوالے سے مسلمان اپنا نقطہ نظر واضح طور پر رکھ سکیں۔

حوالہ جات:

[1] https://theweek.com/articles/555371/why-religion-dominate-21st-century
[2] https://theweek.com/articles/555371/why-religion-dominate-21st-century
[3] https://www.religion-online.org/book-chapter/chapter-5-religions-and-globalization/
[4] https://sdgs.un.org/
[5] https://interfaithrelations.com/urdu/tid/23545/%D8%A8%DB%8C%D9%86-%D8%A7%D9%84%D9%85%D8%B0%D8%A7%DB%81%D8%A8-%D8%B1%D9%88%D8%A7%D8%AF%D8%A7%D8%B1%DB%8C/

[6] طاہر القادری، محمد، اسلام اور اہل کتاب، لاہور، منہاج القرآن پبلی کیشنز، 2015، ص61

Taher Al-Qadri, Muhammad, Islam and the People of the Book, Lahore, Minhaj Al-Qur'an, Publishing Games, 2015, p. 61

[7] http://alsharia.org/2017/nov/khatirat-ammar-nasir

[8] طاہر القادری، محمد، اسلام اور اہل کتاب، لاہور، منہاج القرآن پبلی کیشنز، 2015، ص192

Taher Al-Qadri, Muhammad, Islam and the People of the Book, Lahore, Minhaj Al-Qur'an, Publishing Games, 2015, p. 192

[9] ایضا، ص62

Taher Al-Qadri, Muhammad, Islam and the People of the Book, Lahore, Minhaj Al-Qur'an, Publishing Games, 2015, p. 61

[10] ذکی الرحمن غازی، غیر مسلموں سے تعلقات کی شرعی حیثیت، نیو دہلی، انڈیا، اسلامک بک سروس، 2014، ص24-23

Zaki-ur-Rahman Ghazi, Non-Muslims, 4 Shari'a Relationships, New Delhi, India, Islam Bek Saroos, 2014, pp. 23-24

[11] ایضا، ص34

Zaki-ur-Rahman Ghazi, Non-Muslims, 4 Shari'a Relationships, New Delhi, India, Islam Bek Saroos, 2014, pp. 34

[12] ایضا، ص66

Zaki-ur-Rahman Ghazi, Non-Muslims, 4 Shari'a Relationships, New Delhi, India, Islam Bek Saroos, 2014, pp. 66

[13] ایضا، ص250-249

Zaki-ur-Rahman Ghazi, Non-Muslims, 4 Shari'a Relationships, New Delhi, India, Islam Bek Saroos, 2014, pp. 249-250

[14] ایضا، ص853

Zaki-ur-Rahman Ghazi, Non-Muslims, 4 Shari'a Relationships, New Delhi, India, Islam Bek Saroos, 2014, pp. 853

[15] ذکی الرحمن غازی، غیر مسلموں سے متعلق شرعی احکام، نیو دہلی، فرید بک ڈپو، 2014، ص42-41

Zaki-ur-Rahman Ghazi, Non-Muslims, 4 Shari'a Relationships, New Delhi, India, Islam Bek Saroos, 2014, pp. 41-42

[16] اختر امام عادل، مولانا مفتی، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل، بہار، مفتی ظفیر الدین اکیڈمی جامعہ ربانی منورواشریف، س ن، ص23-22

Akhtar Imam Adil, Maulana Mufti, Problems of Muslims in Non-Muslim Countries, Bihar, Mufti Zafiruddin Academy, Jamia Rabbani Manwar Sharif, S.N., pp. 23-22

[17] اختر امام عادل، مولانا مفتی، بین مذہبی مذاکرات احکام وآداب، بہار، مفتی ظفیر الدین اکیڈمی جامعہ ربانی منوراو شریف، س ن، ص94-93

Akhtar Imam Adil, Maulana Mufti, Inter-Religious Negotiations, Rules and Etiquette, Bihar, Mufti Zafiruddin Academy, Jamia Rabbani Manorao Sharif, S.N., pp. 94-93

[18] اختر امام عادل، مولانا مفتی، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل، بہار، مفتی ظفیر الدین اکیڈمیجامعہ ربانی منورواشریف، س ن، ص101

[19] ایضا، ص124

Akhtar Imam Adil, Maulana Mufti, Problems of Muslims in Non-Muslim Countries, Bihar, Mufti Zafiruddin Academy, Jamia Rabbani Manwar Sharif, S.N., pp. 124